Geo-Cultural Elements in Dr. Wazir Agha's Poem

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم میں ارضی ثقافتی عناصر

Zulfiqar Ali*[1]
Mphil Scholar, Department of Urdu, University Of Sargodha.
Dr. Sumera Ijaz*[2]
Associate Professor, Department of Urdu, University Of Sargodha.

ذوالفقار علی☆[1]

ایم فل اردو سکالر، یونیورسٹی آف سرگودھا

ڈاکٹر سمیرا اعجاز☆[2]

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

Correspondance: zulfiqarahsen@yahoo.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 25-07-2025
Accepted:26-09-2025
Online:29-09-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: After the establishment of Pakistan in the Indian subcontinent, various movements emerged, of which the Islamic Literary Movement was the most prominent. During the long rule of Muslims in the subcontinent, not only did civilization and civilization progress take place, but also an extraordinary growth was seen in the linguistic and literary fields. The script of the Urdu language was arranged in the Arabic style, and words from Arabic and Persian as well as other languages were also included in it. With this combination, Urdu emerged as a language in which the deep influences of Islamic culture were evident. Since Urdu flourished during the Muslim era, it was generally considered to be the language reflecting Muslim culture. Regarding the land-based cultural movement, Dr. Wazir Agha taught writers to be connected to the land, where he also advised them to be connected to their own civilization and culture. He also advises them to stay connected to their own history. He does not seek Pakistani civilization and culture by cutting off from the civilizations of Mohenjo-daro, Harappa and the Indus Valley. In Dr. Wazir Agha's famous book "Urdu Poetry's Mood", first published in 1965, he called the land the foundation of literature and civilization. According to him, this land came into existence through the fusion of ancient Dravidian and Aryan civilizations.

KEYWORDS: Geo-Cultural, civilization, Dr.

زمین اور اس سے جڑی ثقافتی و تہذیبی اقدار کسی بھی خطے کے باشندوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ اقدار نہ صرف طرزِ زندگی کی سمت متعین کرتی ہیں بلکہ خطے کے لوگوں کو ایک منفرد شناخت بھی دیتی ہیں۔ گویا زمین سے وابستہ تہذیبی و ثقافتی اقدار زندگی کے ڈھانچے کی بنیاد بنتی ہیں۔ یہ بنیاد نہ صرف بیرونی عوامل سے تشکیل پاتی ہے بلکہ سماج کے اندرونی رویوں اور طرزِ عمل سے بھی نمایاں طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اس طرح زمین اور تہذیب و ثقافت کا ایک گہرا ربط قائم ہوتا ہے، جو کسی خطے کی شناخت کے لیے ناگزیر ہے۔

تخلیقی عمل سماجی، تہذیبی اور ثقافتی عناصر سے تحریک حاصل کرتا ہے، جو کسی خطے یا زمین سے مخصوص ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے کی ادبی تخلیقات میں وہاں کے زمینی و ثقافتی عناصر کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب اردو ادب میں مغربی تنقیدی نظریات کی بھرمار ہوئی، تو مقامی دانشوروں نے اپنی زمینی و ثقافتی شناخت کو محفوظ رکھنے اور اسے ادبی تخلیق کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں اسلامی ادب، پاکستانی ادب اور بعد ازاں ارضی ثقافتی تحریک وجود میں آئی۔ یہ تحریک قیامِ پاکستان کے بعد شروع ہوئی اور اس کا بنیادی مقصد اپنی زمین سے محبت کا جذبہ جگانا اور غیر ملکی ثقافت کے مقابلے میں اپنی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا تھا۔ اس میں نہ صرف تہذیب و ثقافت بلکہ تاریخ سے جڑت کا پیغام بھی شامل ہے۔ اس تاریخ میں موہن جو داڑو، ہڑپہ اور سندھ میں مسلمانوں کی آمد کے علاوہ گندھارا تہذیب کے آثار بھی شامل ہیں۔ بدھ مت اور ہندو مت کی تہذیبوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، کیونکہ ان تہذیبوں سے جڑے بغیر ہم اپنی تہذیبی شناخت کے عناصر کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ انھی تہذیبوں کی گود سے مسلم تہذیب نے جنم لیا۔

قیام پاکستان کے ابتدائی چند سالوں کے سیاسی حالات زیادہ ساز گار نہ تھے۔ پاکستان کی مخالفت کرنے والوں کا ایک طرف شور و غوغا تھا تو دوسری طرف پاکستان سے وابستہ امیدیں اور خواب چکنا چور ہونا شروع ہوئے تو کئی طرح کے ایقان سوالیہ نشان بن گئے اس دقت سب سے بڑا مسئلہ تہذیبی شناخت کا ابھر کر سامنے آیا–اس سوال نے بھی سر اٹھایا کہ پاکستانی تہذیب کی جڑیں کہاں تک ہیں–ترقی پسندوں نے جب مذہب کی مخالفت کی تو اس وقت ایک یہ رویہ بھی اُبھرا کہ پاکستان چونکہ کلمہ طیبہ کے نام پر قائم ہوا تھا–اس کی اساس صرف اسلام پر اُٹھائی گئی تھی پھر ادب میں ایسے عناصر کی تلاش شروع ہوئی جس کی روح اسلامی ہو۔سب سے پہلے ترقی پسندوں کی مخالفت کی گئی اور اس کے لیے ادبِ اسلامی کی تحریک اُبھری–اس تحریک نے آگے چل کر جب ادب کے فروغ حصہ لینا شروع کیا تو کئی طرح کے پھر مسائل سامنے آنے لگے وہ خالص ادبی فن پاروں کو اسلامی نکتہ نظر سے پرکھنے لگے اور ادب کا کینوس بڑھنے کے بجائے محدود پیمانوں میں

سمٹنے لگا تو اس وقت تہذیب کی بقا اور سلامتی کا مسئلہ بھی در پیش آیا اور پھر اُس وقت ایک گھمبیر صورتِ حال سامنے آئی کیونکہ اُس وقت تہذیبی شناخت میں تین سمتیں نمایاں ہونے لگیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر عابد سیال لکھتے ہیں:

"پہلے گروہ کے مفکروں کا مؤقف تھا کہ تاریخ روحانی اقدار سے وجود میں آتی ہے اور یہ روحانی اقدار جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں سے بلند اور قید مکان سے آزاد ہوتی ہے لہٰذا پاکستانی معاشرے کی تہذیبی جڑیں اس آفاقی معاشرے میں ہیں جس کی تشکیل اسلام کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے زیر اثر ہوئی۔یوں پاکستانی تہذیب اتنی ہی پرانی ہے جتنی اسلامی تاریخ۔اس مکتبہ فکر کو لوگوں کے نزدیک زمینی رشتوں کی اہمیت صرف اسی حد تک اہم اور قابل قبول تھی جس حد تک وہ ان مذہبی ی اخلاقی اور روحانی اقدار سے واقفیت رکھتے تھے۔دوسرا مؤقف ان مفکرین کا تھا جن کو نزدیک معاشرت کا وجود مادی حقیقتوں پر منحصر ہے اور زمینی رشتے تہذیبی تعلق کی اساس ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کی تہذیب وہی ہے جو اس سرمین کی تہذیب ہے اور جو موہنجوداڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کی قدیمی روایات سے پھوٹی اور یہاں کی علاقائی روایات میں رچتی بستی ہوئی ہم تک پہنچی۔تیسرے گروہ مفکرین کا زاویہ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس سرزمین کی تہذیب نے ایک نئی امتزاجی صورت اختیار کی جس میں اس سرزمین کی قدیم تہذیب کی زندہ روایات بھی شامل ہیں اور اسلامی روح بھی رچی بسی ہے اور جسے عرف عام میں ہند مسلم تہذیب کہا جاتا ہے۔پاکستانی تہذیب اسی ہند مسلم تہذیب کا تسلسل ہے۔"(۱)

برصغیر پاک وہند میں پاکستان کے قیام کے بعد مختلف تحریکوں نے جنم لیا، جن میں تحریکِ اسلامی ادب سب سے نمایاں تھی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے دوران نہ صرف تہذیبی و تمدنی ترقی ہوئی بلکہ لسانی و ادبی میدان میں بھی غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اردو زبان کا رسم الخط عربی طرز پر ترتیب دیا گیا، اور اس میں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوئے۔ اس امتزاج سے اردو ایک ایسی زبان کے طور پر ابھری جس میں اسلامی ثقافت کے گہرے اثرات نمایاں تھے۔ چونکہ اردو مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں پروان چڑھی، اسے عموماً مسلم ثقافت کی عکاس زبان سمجھا گیا۔

سترہویں صدی کے وسط سے برصغیر کے مسلمانوں نے اردو میں اپنے خیالات و جذبات کے تخلیقی اظہار کا سلسلہ شروع کیا، جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں اسلامی تحریک اپنے ابتدائی ایام سے موجود تھی۔ اس تحریک کو تقویت دینے میں کئی نامور اہلِ قلم نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں خواجہ میر درد، مظہر جانِ جاناں، مومن، حالی، اور علامہ اقبال کی شاعری کے ساتھ ساتھ شبلی نعمانی، سلمان ندوی، ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی، عبدالماجد دریابادی، عنایت اللہ مشرقی، اور ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے نثر نگاروں کی تحریریں شامل ہیں۔ ان ادیبوں اور شعرا کی کاوشوں نے اسلامی ادب کی بنیادیں مضبوط کیں اور اسے ایک منفرد شناخت عطا کی۔

تحریکِ ادبِ اسلامی اور پاکستانی ادب کی تحریک کے زوال کے بعد، اردو ادب میں بغیر کسی شعوری کوشش کے ایک فکری رجحان ابھرا، جو ایک طرف اپنی دھرتی سے محبت و عقیدت سے بھرپور تھا اور دوسری طرف تہذیبی اقدار سے مزین بھی۔ ارضی ثقافتی تحریک نے ادب کو زمین سے جوڑا اور اس کے ثمرات سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔ ارضی ثقافتی تحریک تہذیبی تشخص کے ارضی حوالے کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ اس تحریک کے نقوش پہلے سے اردو ادب میں نظر آنا شروع ہو گئے تھے، علامہ اقبال اس کی سب بڑی مثال موجود ہے۔

وزیر آغا (۲۰۱۰-۱۹۲۲) نے اس تحریک کے ابتدائی عناصر علامہ محمد اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۷) کی شاعری میں تلاش کیے، خاص طور پر ان کی نظموں جیسے "ہمالہ"، "ترانۂ ہندی"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت"، "کنارِ راوی"، "ترانۂ ملی"، اور "وطنیت" میں۔ ان کا ماننا تھا کہ اپنی ثقافتی جڑوں کی جستجو کا جذبہ ہی اس تحریک کی بنیاد بنا اور یہی جذبہ بعد میں اس سرزمینِ پاک کی آزادی کی تحریک میں ایک مضبوط محرک ثابت ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس تحریک کو فکری اور نظریاتی اساس مہیا کر کے اسے ایک تحریک کی صورت میں پیش کیا۔ تاہم اس جذبے کی اکمل صورت پہلی مرتبہ میراجی کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ میراجی ارضی ثقافتی تہذیب کا اولین نمائندہ تھا جس نے افکار کی حد تک ہی نہیں اپنی وضع قطع اور رویے کی حد تک بھی خو کو مغربی تہذیب سے گریز کر کے برصغیر کے ماضی سے وابستہ کیا۔ ماضی پرستی اور دھرتی پوجا کا یہ رویہ میراجی کی غزلوں، نظموں اور گیتوں بہت نمایاں کر سامنے آتا ہے۔

> "اردو ادب نے اہلِ ہند کے اس ارضی ثقافتی رجحان کی پوری طرح عکاسی کی اور لکھنے والوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جو مغربی تہذیب اور تمدن کے گن گانے کے بہ جائے (جیسا کہ حالی کے زمانے میں عام تھا) اب اپنی تہذیب اور اس کے ماضی پر فخر کرنے لگا۔" (۲)

پاکستان کے قیام کے بعد اس کے باشندوں کو متعدد چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا، جن میں عمرانی، سیاسی، آئینی، معاشرتی، اقتصادی اور ادبی مسائل شامل تھے۔ چونکہ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریات پر رکھی گئی تھی، اس لیے لبرل ازم

کے حامی کچھ افراد نے ان نظریات کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان حالات میں پاکستانی ادب کی ایک ایسی تحریک کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی جو قومی جذبے کو ابھارے اور اسلامی شعائر، تہذیبی اقدار اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کرتے ہوئے پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کو مضبوط کرے۔ اس ضرورت کے پیش نظر پاکستانی ادب کی تحریک وجود میں آئی، جس کا مقصد ایسے ادب کی تخلیق تھا جو قومی یکجہتی اور نظریاتی تشخص کو فروغ دے۔

ثقافتی اور تہذیبی عناصر کا عمل بنیادی طور پر لاشعوری ہوتا ہے، نہ کہ محض شعوری کوشش کا نتیجہ۔ ہر فرد اپنے اجتماعی لاشعور کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جو اس کی تاریخی اور ثقافتی وراثت کو اپنے اندر سموئے رکھتا ہے۔ اسلامی شعائر اور ثقافتی اقدار وقت کے وسیع دائرے میں پھیلے ہوئے ہیں، اور یہ مراجعت کے بغیر اپنی مکمل شکل میں سامنے نہیں آسکتے۔ پاکستان کا قیام اسلامی اقدار کو نافذ کرنے اور ان کے فروغ کے لیے عمل میں آیا تھا، تاکہ یہاں اسلامی نظریات کو تقویت ملے اور ہم اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اعلیٰ اخلاقی معیارات کو اپنا سکیں۔

تاہم، پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہونے کے باوجود یہاں چوری، ڈکیتی، دہشت گردی، اغوا برائے تاوان، رشوت خوری، ملاوٹ، جھوٹ، فریب، ذخیرہ اندوزی، منافقت، جوا، سود اور غیر قانونی منافع خوری جیسے مسائل بدستور موجود ہیں۔ یہ واضح ہے کہ ان غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث افراد میں سے بیشتر ہمارے اپنے معاشرے کے لوگ ہیں۔ پاکستانی ادب کی تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے اسلامی اقدار کو اپنے کردار و عمل کا حصہ بنائیں۔ یہ اقدار وقتی یا ظاہری طور پر اپنانے سے نہیں، بلکہ طویل مدتی اور گہری وابستگی سے ہی مؤثر ثابت ہو سکتی ہیں۔ جب یہ اقدار ہمارے شعور سے نکل کر ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن جائیں گی، تب ہی پاکستانی ادب کی تحریک اپنے مقاصد حاصل کر سکے گی اور اس کے ثمرات قوم کے لیے ایک مثبت تبدیلی کی صورت میں سامنے آئیں گے۔

ارضی ثقافتی تحریک کیا ہے اور اس کے دائرہ کار میں کون کون سی چیزیں شامل ہیں، اسے سمجھے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے "ارض"، "ثقافت" اور "تحریک" کے معنی و مفہوم کو سمجھا جائے۔ جب ہم "ارض" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد زمین یا دھرتی ہے۔ لفظ "ارض" اردو میں رائج ہے اور اس کے معنی "زمین" یا "دھرتی" ہیں، جبکہ اس کے لغوی معنی "وطن" سے ہیں۔ وطنِ عزیز وہ دھرتی ہے جہاں کے باشندے آزادی کے ساتھ اپنے رسم و رواج، مذہبی تہوار، کھیل، لباس، زبان اور تاریخ کو اپنا سکتے ہیں۔ یہی ثقافت ہے۔ ثقافت بیرونی اثرات سے نہیں، بلکہ اپنے علاقے، خطے اور وطن کی زمین سے جڑے رسم و رواج اور طور طریقوں سے پروان چڑھتی ہے۔ تہذیب اور ثقافت ایک دوسرے سے قریب ہیں، اور اسی لیے ڈاکٹر جمیل جالبی ان دونوں کو ملا کر "کلچر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے استعمال کا جواز پیش کرتے ہیں۔

"میں نے لفظ ثقافت اور تہذیب کے معانی یکجا کر کے ان کے لیے ایک لفظ
کلچر استعمال کیا ہے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل
ہیں۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری
سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا مسادی خارجی ہوں یا داخلی احاطہ
کرلیتا ہے"(۳)

ڈاکٹر وزیر آغا نے ارضی ثقافتی تحریک کے حوالے جہاں لکھنے والوں کو دھرتی کے ساتھ جڑت کا درس دیا وہاں انھوں نے اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ بھی انسلاک کا مشورہ دیا ہے۔وہ اپنی تاریخ کے ساتھ بھی جڑے رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔وہ موہنجو داڑو، ہڑپہ اور وادی سندھ کی تہذیب سے کٹ کر پاکستانی تہذیب و ثقافت کو تلاش نہیں کرتے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی معروف کتاب "اردو شاعری کا مزاج" جو پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی، میں انھوں نے دھرتی کو ادب اور تہذیب کی بنیاد قرار دیا۔ان کے مطابق، یہ دھرتی قدیم دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کے امتزاج سے وجود میں آئی، جس سے گیت کی صنف نے جنم لیا۔ بعد ازاں، دراوڑی تہذیب سے عجمی اور اسلامی تہذیبوں نے ارتقا پذیر ہو کر اردو غزل کی تخلیق کا باعث بنیں۔بالآخر، جب مغربی تہذیب کا اس دھرتی کی مقامی تہذیب سے اشتراک ہوا، تو اس سے اردو نظم وجود میں آئی۔یہی وہ فکری نظریہ ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کے خیالات کی بنیاد بنتا ہے۔ان کی کتاب اردو شاعری کا مزاج کا نقطہ نظر اسی فکری محور کے گرد گھومتا ہے۔

ارضی ثقافتی تحریک ۱۹۶۵ء کی پاک-بھارت جنگ کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا نے شروع کی، جو قومی جذبات اور مقامی ثقافت کی حفاظت پر مبنی تھی۔یہ تحریک ادب کو سرزمین کی محبت اور ثقافتی ورثے سے جوڑتی ہے، جہاں وطن پرستی اور قومی شعور کو فروغ دیا جاتا ہے۔وزیر آغا کی تنقید میں یہ تحریک پاکستانی ادب کے طرزِ احساس کو مضبوط کرتی ہے، جیسا کہ ان کی کتابوں شام کی منڈیر سے (۱۹۸۶)، نئے تناظر (۱۹۷۹ء)، اردو شاعری کا مزاج (۱۹۷۴ء) اور پاکستانی ادب کا جائزہ (۱۹۸۱) میں دیکھا جا سکتا ہے۔انور سدید کی کتاب ڈاکٹر وزیر آغا (ایک مطالعہ) (۱۹۸۳) میں اس تحریک کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جہاں یہ ادب میں نئی اصناف جیسے انشائیہ کو مقبولیت دلانے کا ذریعہ بتایا جاتا ہے۔وزیر آغا کی شاعری میں یہ تناظر دھرتی کی "پوجا" (عبادت) کے تصور سے جڑتا ہے، جو ان کی زمیندارانہ پس منظر سے ابھرتا ہے—وہ کھیتوں میں بیج بو کر پودوں کی نشوونما دیکھتے اور اسے علامتی طور پر شاعری میں سمو دیتے تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی نظموں میں ارضی و ثقافتی عناصر کو نمایاں کرتے ہیں، جہاں وہ زمین سے گہری وابستگی کی بات کرتے ہیں، وہیں اپنی تہذیب و ثقافت سے ربط کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔کوئی بھی قوم اپنی تہذیب و ثقافت کی بدولت اپنی شناخت قائم رکھتی ہے۔جو قومیں اپنی ثقافتی وراثت کو ترک کر دیتی ہیں، وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتیں۔جب کسی قوم

سے اس کی تہذیب و ثقافت چھین لی جاتی ہے، تو وہ جلد ہی اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔ ارضی ثقافتی تحریک نہ صرف زمین سے گہرا تعلق استوار رکھتی ہے بلکہ ثقافتی روایات کے ساتھ بھی اس کا ربط نہایت مضبوط ہے۔ یہ تحریک زمین اور ثقافت کو ساتھ لے کر آگے بڑھتی ہے۔

وزیر آغا کی نظموں میں ارضی و ثقافتی عناصر کی موجودگی کا جائزہ لیا جائے گا۔ مثال کے طور پر، ان کی نظم "شام" میں شام کو ایک مشرقی دلہن کے روپ میں پیش کر کے وہ اپنی ثقافتی روایات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔

شام اگر تُو دلہن ہوتی
چمکیلی زربفت کی ساڑھی تجھ پر سجتی
پات، وداع کے گیت سناتے
اور ہَوا شہنائی بنتی
سارے دُکھ اور سارے سکھ
باراتی ہوتے
سورج کے پلّو سے بندھ کر
تُو جانے کس دور نگر کی جانب جاتی (۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم "شام" کی سطروں میں "دلہن"، "زربفت کی چمکیلی ساڑھی"، "وداع کے گیت"، "شہنائی"، اور "باراتی" جیسے عناصر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں، جو ایک لڑکی کی رخصتی اور اس سے جڑی ثقافتی روایات کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ وزیر آغا کی شاعری میں تہذیب و ثقافت کا رنگ جگہ جگہ نمایاں ہے، کیونکہ وہ اس دھرتی سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور اس کی ثقافتی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں ان عناصر کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے شام کو ایک دلہن کے روپ میں پیش کر کے مشرقی روایات کے مطابق وداع کے گیتوں اور شہنائی جیسے مخصوص ساز کو شامل کیا ہے۔ شہنائی، جو ہندوستان میں شادی بیاہ اور مذہبی جلوسوں کے موقع پر بجائی جاتی ہے، ایک اہم ثقافتی علامت ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس نظم میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی بھرپور انداز میں عکاسی کی گئی۔

ڈاکٹر وزیر آغا تہذیبی ثقافتی عناصر کو لے کر ایسی نظمیں تخلیق کرتے ہیں کہ جس سے دھرتی کے ساتھ انسلاک بھی ہوتا ہے اور قدیم تہذیب کے اثرات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ وزیر آغا اپنی نظموں میں تجسیم کے ذریعے نہایت دلکشی اور دلفریبی پیدا کرتے ہیں۔ نظم "بارش کے بعد" میں انھوں نے کھیتیوں کو دُلہن بنا کر پیش کر دیا ہے کہتے ہیں:

صُبح چھینٹا پڑا

خشک دھرتی ہنسی
کھیتیاں دُلہنوں کی طرح گنگنائیں
ہمیں آتے دیکھا تو اتنا لجائیں کہ پتوں کے گھونگھٹ میں چھپنے لگیں
سرافراز لہراتے گنّے کے کھیتوں نے
سہروں کی درزوں سے جھانکا ہمیں
اور شکووں کے تیروں سے
چھلنی کیا دیر سے آنے والے سبھی دوستوں کو
براتی....پرندے، ہَوا، بادلوں کے سُبکبار گھوڑے
بزرگوں میں سورج، درختوں میں برگد، پرندوں میں گِدھ
سب نے مِل جُل کے، آتے زمانوں کی خاطر
ہمارا سواگت کیا(۵)

ڈاکٹر وزیر آغا ہندومت کے بارے گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ وہ ہندو مذہب کے بارے میں ایسی ایسی معلومات رکھتے تھے کہ بعض اوقات ہندو دھرم سے تعلق رکھنے والے احباب بھی متحیر رہ جاتے تھے۔ دراصل کے والد گرامی آغا وسعت علی خان ویدانیت کا گہرا مطالعہ رکھنے والے مذہبی سکالر تھے۔ وزیر آغا ان سے اکتساب فیض کرتے رہے ہیں اور یہ علم بچپن ہی سے ان کی گھٹی میں پڑ گیا تھا۔ پھر آگے چل کر جب وزیر آغا نے خود اس کا مطالعہ کیا تو انہیں اس مذہب کی مزید گہرائیوں کا پتہ چلا۔ ان کی اکثر نظموں میں ہندوازم کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وزیر آغا کی طویل نظم ”آدھی صدی کے بعد“ میں بعض جگہوں پر ہندی تہذیب وثقافت پر بھی بات ملتی ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں:

دکھ کی ننگی خوشی
اور خوشی کی سلگتی ہوئی پیڑ
کے درمیاں
اک نشاں
جیسے لچھمن کی ریکھا
جیسے پاؤں کی نوک چھولے
تو تاریخ کا رخ بدلنے لگے!(۶)

ہندی اساطیر میں رام، سیتا، لکشمن اور راون کی کہانی مشہور ہے۔ جب رام ایک سونے کے ہرن کا پیچھا کرنے جنگل جاتا ہے اور دیر تک واپس نہیں آتا، تو سیتا لکشمن سے کہتی ہے کہ وہ رام کو تلاش کریں۔ لکشمن جانے سے پہلے سیتا کے گھر کے باہر ایک لکیر کھینچتا ہے، جسے " لچھمن ریکھا" کہا جاتا ہے، اور ہدایت دیتا ہے کہ اسے پار نہ کیا جائے، کیونکہ یہ لکیر

حفاظتی دائرہ ہے۔ لکشمن کے جانے کے بعد راون جوگی کے روپ میں خیرات مانگنے کے بہانے سیتا کے پاس آتا ہے اور اسے لکیر پار کرنے پر اکساتا ہے۔ جیسے ہی سیتا لچھمن ریکھا عبور کرتی ہے، راون اسے اغوا کرلیتا ہے۔ بعد میں رام ہنومان کی قیادت میں بندروں کی فوج کے ساتھ راون کو شکست دے کر سیتا کو آزاد کرواتا ہے۔ اردو کے کئی شعرا نے اس اساطیری کہانی کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اپنی نظموں میں " لچھمن ریکھا" کا ذکر کر کے اس کہانی کو علامتی طور پر پیش کیا اور ہندی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کیا۔ اس کہانی کو وہی شاعر اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنا سکتا ہے جو اس سے واقف ہو اور اس کہانی کے تمام کرداروں کے بارے جان کاری رکھتا ہو–وزیر آغا کے ہاں ہمیں ہندی تہذیب و ثقافت کی بہت سی کہانیوں اور واقعات کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

اور پھر....یوں ہوا
سرسراتی سی پرچھائیں
یم راج کی
میری پیہم روانی پہ
برہم ہوئی
میرے پیچھے
دبے پاؤں آنے لگی (۷)

ہندو اساطیر میں یم راج کو موت کا دیوتا مانا جاتا ہے، جو دوزخ کا مالک بھی ہے۔ ہندو دھرم کے مطابق ایک ہی دیوتا اپنی جمالی اور جلالی شکل میں جنت اور جہنم دونوں کا نظم کرتا ہے۔ جنت میں اسے "دھرم راج" کہا جاتا ہے، جبکہ دوزخ میں وہ "یم راج" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندو عقائد کے مطابق گندگی اور تکلیف دوزخ کی علامت ہیں، جبکہ خوشی، پاکیزگی اور راحت جنت کی نشانی ہیں۔ تمام مذاہب میں یہ بات مشترک ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا سامنا کرنا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حضرت عزرائیل علیہ السلام کو موت کا فرشتہ مقرر کیا گیا ہے، جو جانوں کو قبض کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح ہندو دھرم میں یم راج کو موت کا دیوتا سمجھا جاتا ہے، جو جانوں کو لے کر جنت یا جہنم کا فیصلہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی زندگی میں موت کو کئی بار قریب سے دیکھا۔ ایک بار وہ خود فراموشی کی حالت میں ریل کی پٹری پر چلتے ہوئے حادثے سے بال بال بچے، جیسے کوئی الٰہی ہاتھ انہیں بچانے کے لیے آگے بڑھا ہو۔ بچپن میں وہ ایک لکڑی کے پنگھوڑے سے گرتے گرتے بچ گئے، جو گاؤں کے ترکھان نے تحفے میں بنایا تھا اور اسے کوئی جانور یا بچھڑا کھینچ رہا تھا۔ اس وقت بچھڑا بے قابو ہو گیا تھا، لیکن وزیر آغا معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ اس طرح کے کئی واقعات ان کی زندگی کا

حصہ رہے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کے تصور کو اپنی شاعری میں بھی سمویا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں میں علامت نگاری اور تمثیل نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ علامتوں اور تمثیلوں کے ذریعے اپنی شاعری کو گہرائی اور اثر انگیزی عطا کرتے ہیں۔ چونکہ وہ زمیندار تھے، ان کا زمین سے تعلق نہایت گہرا اور مستحکم تھا۔ مٹی سے ان کی وابستگی غیر معمولی تھی، اور وہ دھرتی سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ اردو ادب میں انھوں نے سب سے پہلے "دھرتی پوجا" کا تصور پیش کیا۔ وہ کھیتوں میں بیج بوتے، پودوں کی نشوونما دیکھتے، اور ان کی شاخوں پر کلیوں کے کھلنے کا مشاہدہ کرتے۔ یہ تجربات اور مشاہدات انھوں نے اپنی نظم "آنکھ صدف بن جاتی ہے" میں علامتی انداز میں نہایت خوبصورتی سے سموئے ہیں۔

آواز کی کوری دھرتی پر
جب حرف کے بیج بکھرتے ہیں
اور لفظ کے پودے اگتے ہیں
جب لفظ کی نازک شاخوں سے
کلیوں کی پود نکلتی ہے(۸)

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی نظم "آواز کی کوری دھرتی پر" میں "کوری دھرتی" سے مراد ایسی زمین لیتے ہیں جو ابھی تک بنجر ہے، جہاں کچھ بھی نہیں بویا گیا۔ یہ اس خالی کاغذ کی مانند ہے جس پر کوئی لفظ نہیں لکھا گیا۔ اسی طرح، "کوری دھرتی" سے ان کی مراد وہ زمین ہے جہاں پہلی بار حرف کا بیج بویا جاتا ہے۔ یہ "حرف کا بیج" ایک منفرد اور تازہ خیال ہے، جو پڑھنے والے کے دل میں ایک خوش گوار حیرت پیدا کرتا ہے۔ نظم کی ابتدائی سطر "آواز کی کوری دھرتی پر" ہی اپنی شعری چاشنی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وزیر آغا نے اس نظم کو نہایت خوبصورتی اور فن کارانہ مہارت سے تخلیق کیا ہے۔ ان کے مطابق، جب آواز کی کھیتی میں حرف کے بیج بکھیرے جاتے ہیں، تو لفظوں کے پودے اُگنے لگتے ہیں، اور ان پودوں کی نازک شاخوں پر کلیاں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ عمل گویا ایک لامتناہی تخلیقی سلسلے کی ابتدا ہے۔ وزیر آغا کی شاعری میں دھرتی سے گہری محبت اور عقیدت کا پیغام ملتا ہے۔ وہ اپنی مختلف نظموں میں زمین سے والہانہ لگاؤ اور اس کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے ارضی و ثقافتی تناظر کو بنیاد بنا کر ایک شاندار شاعرانہ شاہکار پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی شاعری میں دیہی رسومات اور رواجوں کو گہرائی سے سموئے رکھا تھا۔ وہ دیہاتی تہذیب و ثقافت سے پوری طرح واقف تھے اور وہاں کے لوگوں، خاص طور پر لڑکیوں کے نفسیاتی رویوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ دیہاتوں میں بعض لڑکیاں عزت و ناموس کی خاطر یا کسی خوف کے باعث کنوؤں میں چھلانگ لگا کر اپنے خاندان کی عزت بچاتی تھیں۔ اسی

طرح، جب کوئی فاتح قوم حملہ آور ہو کر آتی تھی، تو شاہی خاندان کی خواتین خود کو آگ لگا لیتیں یا کنوؤں میں کود کر اپنی عزت کی حفاظت کرتی تھیں۔ وزیر آغا نے اسی نوعیت کی ایک کہانی کو اپنی نظم "کسی کسی دن" میں نہایت اثر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔

اور خوشی
وہ گڑیا سی اک نازک لڑکی
وہ تو اتنا ڈر جاتی ہے
میرے گھر کے
اندھے اور سُنسان کنوئیں میں
کود کے جان بچاتی ہے؟(۹)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی اہم نظم "کسی کسی دن" میں لڑکیوں کے نفسیاتی رویوں سے متعلق ایک گہری کہانی کو نہایت فن کاری سے بیان کیا ہے۔ یہ کہانی لڑکیوں کی زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ تاریخ میں ایسے واقعات ہوتے رہے ہیں کہ جب کسی لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی طے کر دی جاتی تھی، تو وہ دل شکستہ ہو کر کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دیتی تھی۔ لیکن وزیر آغا اس نظم میں ایک مختلف زاویہ پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ دکھ کی اتنی عادت ڈال چکے ہیں کہ جب خوشی ہمارے دروازے پر دستک دیتی ہے، تو ہم الٹا پریشان ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ خوشی ہمارے لیے کیا لائی ہے۔ انھوں نے خوشی کو ایک نازک سی لڑکی سے تشبیہ دی ہے، جو بالآخر کنویں میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ کنویں میں چھلانگ لگانے کی یہ روایت برصغیر میں بہت پرانی ہے، اور وزیر آغا نے اسے اپنی نظم میں سمو کر تہذیبی و سماجی رویوں کو اجاگر کیا ہے، یہ بتاتے ہوئے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں اکثر ایسی شدت پسندانہ حرکت کر جاتی تھیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے جب ارضی ثقافتی تحریک کے خدوخال واضح کیے تو ان کی زمین سے گہری وابستگی نے ان پر دھرتی پوجا کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ درحقیقت، وزیر آغا زمین سے اس قدر محبت اور لگاؤ رکھتے تھے کہ وہ بعض اوقات زمین کو ماں کے روپ میں دیکھتے تھے۔ وہ زمین کو تانیث جب کہ آسمان کو تذکیر کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔ پیاسی دھرتی جب آسمان کی طرف دیکھتی ہے تو وہ بارش کی صورت میں اسی نہ صرف پیاس بجھاتا ہے بلکہ اس کی بنجر کوکھ میں ہریالی بھی لاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا دھرتی کو ماں کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔ وہ برگد کے پیڑ کو بھی ماں کا روپ دھارے دیکھتے ہیں کیونکہ برگد کا پیڑ بھی ماں کی طرح ہوتا ہے وہ اپنے پروں کے نیچے پرندوں اور دیگر جانداروں کو چھپاتا ہے انہیں دودھ بھی فراہم کرتا

ہے۔ برگد کی شاخیں لوری بھی سناتی ہیں جس کے نیچے آنے والوں کو راحت اور سکون کا سامان ملتا ہے اس حوالے سے ان کی نظم "ماں" کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

وہ برگد کا اک پیڑ تھی
جس کی مانوس، گہری، کنک چھاؤں میں
ہم نے عمریں بتائیں
وہ مخمل کا اک نرم چھتنار تھی
جس کے پتوں میں چھپ کر
مہکتی ہوئی دودھیا شاخ کو تھام کر
ہم نے میٹھی سی راحت کا انعام پایا
وہ پتوں کے پنکھے سے
شاخوں کی لوری سے ہم کو سُلاتی رہی
مسکراتی رہی!(۱۰)

برصغیر میں برگد کا درخت بہت مقدس مانا جاتا ہے کیونکہ یہ قدیم روایات کا محافظ ہے۔ اس کے نیچے لوگ بیٹھتے ہیں، جہاں ٹھنڈی اور آرام دہ چھاؤں ملتی ہے۔ اسی وجہ سے برگد کے درخت کو ماں کی مانند سمجھا جاتا ہے۔ یہ درخت ہزاروں پرندوں کو اپنی پناہ میں سمیٹے رکھتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی بہت سی نظموں میں دھرتی کو ماں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی نظم "الاؤ" بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری میں ارضی و ثقافتی عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، جو تخلیقی گہرائی اور معاصر حساسیت کے امتزاج سے مزین ہیں۔ وہ دھرتی سے گہری وابستگی رکھتے تھے، اس سے رزق حاصل کرتے تھے اور اس کی آغوش میں جیتے تھے۔ ان کے لیے دھرتی ایک طرف ماں کی مانند تھی، تو دوسری طرف برگد کا پیڑ بھی انہیں ماں کے روپ میں دکھائی دیتا تھا، جس کی کئی خصوصیات ماں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، وہ قدیم تہذیبوں جیسے موہنجوداڑو، ہڑپہ، گندھارا اور وادی سندھ سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی، سمیری، مصری اور بدھ مت تہذیبوں کے عناصر بھی جھلکتے ہیں۔ وہ تلمیحات، تشبیہات اور علامتوں کے ذریعے ان تہذیبوں کو اپنی نظموں میں سمو دیتے تھے۔

وزیر آغا کی نظموں میں علامتی انداز غالب ہے، جن کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے قاری کو ان علامتوں سے واقفیت درکار ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا سرسری مطالعہ ان کی تفہیم کو مشکل بنا دیتا ہے۔ جب تک قاری نظموں کے باطنی معنی تک نہ پہنچے،

ان کا گہرا پیغام سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔ وزیر آغا ایک ایسے شاعر اور ادیب تھے جن کا زمین سے گہرا رشتہ تھا۔ وہ خود زمیندار تھے، اس لیے زمین کی بھینی خوشبو، ہل چلنے سے اٹھنے والی مٹی کی مہک ان کی مشامِ جاں کو معطر کرتی تھی۔ یہ خوشبو وہی سمجھ سکتا ہے جو زمین سے گہری محبت رکھتا ہو۔

ان کی شاعری میں ارضی و ثقافتی عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔ انھوں نے ارضی ثقافتی تحریک کو نئی جہت دی اور اپنے ادبی رسالے "اوراق" میں اس کے لیے متعدد مضامین اور اداریے تحریر کیے۔ خاص طور پر 1965 کی جنگ کے بعد، انھوں نے اہلِ قلم کی ایک بڑی تعداد کو اس تحریک سے جوڑا، جس سے ادیبوں میں دھرتی سے محبت اور عقیدت کا جذبہ پروان چڑھا۔ یہ تحریک دیگر اہلِ قلم میں تیزی سے پھیلی۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے، جو ہمیں شناخت عطا کرتا ہے۔ اگر وطن نہ ہو تو ہماری شناخت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ وزیر آغا اپنی شاعری میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف سفر کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عابد سیال، ڈاکٹر "ارضی ثقافتی تحریک، ڈاکٹر وزیر آغا اور اردو غزل" مشمولہ اسالیب (سرگودھا: شمارہ نمبر ۱۳، ۲۰۱۱ء)، ص ۷۱

۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نئے تناظر، الہ آباد: اردو رائٹرس گلڈ، ۱۹۷۹، ص ۶۰

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن 1985، ص ۴۲

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، گھاس میں تتلیاں، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷

۵۔ ایضاً، ص ۸۹

۶۔ وزیر آغا، آدھی صدی کے بعد، چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل، ص ۵۸۰

۷۔ ایضاً، ص ۵۸۵

۸۔ وزیر آغا، عجب اک مسکراہٹ، سرگودھا: مکتبہ نردبان، ۱۹۹۷ء، ص ۳۰

۹۔ وزیر آغا، دیکھ دھنک پھیل گئی، ص ۲۰

۱۰۔ وزیر آغا، دن کا زرد پہاڑ، مشمولہ، چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیات)، ص ۳۶۶

References:

1. Abid Sial, Dr., Arzi Saqafati Tehreek: Dr. Wazir Agha aur Urdu Ghazal, Sargodha: Asaleeb, Issue No. 13, 2011, p. 71.
2. Wazir Agha, Dr., Naye Tanazur, Allahabad: Urdu Writers Guild, 1979, p. 60.

3. Jameel Jalibi, Dr., Pakistani Culture, Islamabad: National Book Foundation, 1985, p. 42.
4. Wazir Agha, Dr., Ghaas Mein Titliyan, Lahore: Maktaba Jadeed, 1985, p. 17.
5. Ibid, p. 89.
6. Wazir Agha, Dr., Aadhi Sadi ke Baad, Lahore: Chehak Uthi Lafzon ki Chaghal (Kulliyat), p. 580.
7. Ibid, p. 585.
8. Wazir Agha, Dr., Ajab Ik Muskurahat, Sargodha: Maktaba Nardbaan, 1997, p. 30.
9. Wazir Agha, Dr., Dekh Dhank Phel Gayi, Lahore: Maktaba Jadeed, p. 20.
10. Wazir Agha, Dr., Din ka Zard Pahaar, Lahore: Chehak Uthi Lafzon ki Chaghal (Kulliyat), p. 366.